ہماری چند بنیادی قومی خامیاں

فضل حمید

ہمارا معاشرہ روز بروز اپنے مطامح میں مادیت پرست ہوتا جارہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم قلب و نظر کے صحیح تقاضوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ بے نفسی و بے غرضی یعنی حسن عمل کا ہم میں فقدان ہے۔ ہم ان تمام محرکات اور عوامل و عواطف کو جو ہماری روحانی زندگی اور مکارم اخلاق کے مقتضیات ہیں، فراموش کرتے جارہے ہیں، اسی طرح ہم نے ان اقدار کی قیمت مقابلۃً کم کردی ہے۔ جن کا تعلق علوم مجردہ یا ادب سے ہے۔ یا ان اکتسابات سے جو ذہن کو مجلا اور روح کو مصفا کرتے ہیں، لیکن براہِ راست معیشیاتی قدر و قیمت نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ ایک حکیم یا ادیب کی عزت بمقابلہ ایک ماہر علوم طبیعیات کے کم ہوتی ہے۔ ان دونوں پر ایک اعلیٰ منصب دار کو فضیلت تامہ حاصل ہوتی ہے اس کی لِم یہ ہے کہ اول الذکر طبقہ کے لوگ خالصتاً ہماری روحانی و اخلاقی ضرورتوں کے کفیل ہوتے ہیں اور ثانی الذکر قسم کے لوگ ہماری مادی و معاشی ضرورتوں کے پورا کرنے میں ہماری رہبری کرتے ہیں۔ اور آخر الذکر طبقہ کے افراد ہمارے خداوندانِ مجازی یعنی صاحب اقتدار و متصرفِ روزگار ہوتے ہیں۔ غالبِ دیدہ ور اور نکتہ سنج نے ہمیں مادی تن پروری کے کھوکھلے پن سے جو اخلاقی سربلندی سے معرّا ہو، یوں متنبہ کیا ہے۔

ناکس زتنو مندیٔ ظاہر نہ شود کس چوں سنگِ سرِرہ کہ گراں است و گراں نیست

ایک مثالی تصوّریت اور روحانی عینیت رکھنے والے معاشرہ کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ مادیّت وروحانیت کے دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھے ان کی سازگاری سے ہی انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کے آلام وامراض جو دامن گیرِ انسانیت ہیں، اس حقیقتِ نفس الامری کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ہماری تہذیبِ نفس اور مقاصدِ حیات کی سربلندی طبیعیاتی علوم اور فنی وصنعتی ترقی کے قدم بہ قدم اور دوش بدوش نہیں ہوئی مغرب کی میکانکی تہذیب نے اخلاقیات پر مناسب زور دینا ترک کردیا ہے اور خوب وزشت کے مابین عدم تمیز نے جائز مقاصد کے لئے جائز وسائل کے رابطہ کو غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ مغربی ممالک جہاں جمہوری طرزِ زندگی کی آزادی ہے سائنسی مادیّت پرستی کے صدمہ سے ایک حد تک جاں بر ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور کلیسائی روایات کی قوت نے بعض اخلاقی وروحانی قدروں کو اس بنا پر بچا لیا ہے کہ وہ قومی سیرت وکردار کا جزوِ لاینفک بن چکی ہیں۔ لیکن وہ ایشیائی یا افریقی ممالک جنہوں نے اپنے ماضی کا استحقار واستخفاف یا ردّ و انکار کیا ہے اپنی ثقافتی روایتوں اور تمدّنی معتقدات پر خطِ تنسیخ کھینچ رہے ہیں۔ اور اگر آج نہیں تو کل یہ نوبت ضرور آئے گی۔ باقی جو کچھ بچا ہے یا جو بچے گا وہ بے یقینی کے سوا کچھ نہ ہوگا بے یقینی تشکیک وارتیاب سے بھی بدتر ہے۔ تشکیک میں طلبِ حقیقت کا پہلو مضمر ہے اور عدمِ یقین میں بجز بے اطمینانی وبے رخی کے کیا رکھا ہے۔ نصب العین سے معرّا لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے تند ہوا میں اڑتے ہوئے تنکے۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم مادّی ترقی وپیش قدمی کے ناگزیر تقاضوں کو نظر انداز کردیں مادّی دولت ومادّی آسودگی کی تلاش انسان کے لئے ایک امرِ طبعی ہے۔ لیکن متمدن انسان کا مہذب ضمیر لازماً اس بات پر مصر ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع بھی اچھے اور حق بجانب ہوں۔ میری مراد یہ ہے کہ ہماری معاشرتی قدریں سرتاپا مادیاتی یعنی آتنی نیم انسانی خودغرضی پر مبنی نہ ہوں کہ تمام روحانی واخلاقی محرکات جو آدمی کو کم درجے کے حیوانات سے ممیز کرتے ہیں، مفقود ہوجائیں ......

اگرچہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اپنے مطامح ومقاصد اور مساعیِ حیات میں مغرب کی

نسبت بہت زیادہ روحانی ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہ استثنا معدودے چند نفوس کے یہ معاملہ بالعکس ہے مغرب کے خلاف یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کی تہذیب اور تمدن ازسرتاپا مادیاتی ہیں۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ارتفاقات النافعہ ان کے ہاں ہماری نسبت زیادہ کارفرما ہیں۔ اداراتِ خیریہ صدقاتِ جاریہ اور معاشرتی فلاح کی دوسری تحریکیں و تدبیریں ان کے سماجی اداروں اور کلیسائی نظام میں بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اس کے برخلاف ہمارے معاشرہ میں معاشرتی فلاح اور سماجی سدھار کی روح ناپید ہے۔ ہیچو من دیگرے نیست کی اور بات ہے۔ جہاں تک ہماری یاد کا تعلق ہے، ہماری مساجد کسی فلاحی یا خیراتی عزیمت کی حامل نہیں ہیں۔ یہ خارج البحث ہے کہ کسی گذرے ہوئے دور میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔ ہمارے کروڑ پتیوں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بہت کم یہ توفیق نصیب ہوئی ہے کہ وہ اوقاف اور خیراتی ہسپتال مفت تعلیم دینے والی درس گاہوں اور دیگر اداراتِ خیریہ کا قیام عمل میں لائیں۔ ناداروں، اپاہجوں اور نابیناؤں کی دیکھ بھال کے لئے غریب خانے بنائیں یا کم از کم فاقہ کشوں کے لئے لنگر ہی جاری کردیں۔ منظم طریقہ کی خیرات تو ہمارے ہاں تقریباً مفقود ہے۔ انفرادی طور پر بعض اصحابِ خیر خیرات کرتے ہیں لیکن وہ مستحقین کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ خیرات کی اس رسم سے دریوزہ گری کی البتہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

ہمدردی بنی نوع انسان کے جذبہ کی کمی اور صدقاتِ جاریہ کی روح کے فقدان کا سبب یہ ہے کہ ہمارا مقصود حقیقتاً مادی انتفاع اور نفس پروری ہے۔ ہم شاذو نادر ہی کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو ذاتی طور پر ہمارے لئے براہِ راست مفید یا شہرت کا باعث نہ ہو۔ خیرات برائے خیرات اور نیکی برائے نیکی جس کا معاوضہ فی الحقیقت خود فعل میں مضمر ہوتا ہے یعنی انعام بذاتِ خود کا مصداق ہوتا ہے۔ ایسے تصورات و مفہومات ہیں جن سے ہم بخوبی آشنا نہیں یہ تحریک کہ کسی کام کو محض اس لئے سرانجام دیا جائے کہ وہ بنفسہٖ جمیل و لطیف ہے ابھی تک ہمارے غلیّاتِ دماغی میں خوابیدہ ہے اور فعّالی شعور کی جولانگاہ میں نہیں آئی۔ شاید خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا خیال اس وقت پیدا ہوگا، جب قبر میں خلا کا در کھلے گا۔

یہ فکری عادت کہ ہر کام کا صلہ یا عوض دنیا و آخرت میں ہمیں ضرور ملنا چاہیئے، ورنہ حسن عمل اور اعمال خیر یہ بیکار محض ہیں، ہمارے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے ہم خیرات برائے مکافات محض تمثیلاً و امتثالاً کرتے ہیں۔ نہ کہ اس لئے کہ ہم میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے اور انسانیت کے لطیف عواطف اور شفیق محرکات سے ہمارے قلوب متاثر ہیں۔ یہ خیرات بھی محض ایک رسم ہے جس کی بنا پر ہمیں یہ توقع ہے کہ جنت میں ہمیں راحت و آرام میسر ہوگا۔ اس بے نفسی کے نہ ہونے نے ہماری خیرات کی غیر مکتفی صورتوں کو پیدا کیا ہے۔ اس واہمہ سے کہ آخرت میں جنت محض بعض مذہبی رسوم و عوائد یا اوراد و وظائف کے ادا کرنے سے مل جاتی ہے اور نجات و جنّت کا تعلق حسنِ معاملت حقوق العباد، تزکیۂ نفس، تصفیۂ باطن اور فضائل و مکارم اخلاق سے نہیں ہے۔ یا اتنا نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے اخلاقی و روحانی برگ و ساز کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

جذبۂ تعظیم

ہم میں جذبۂ تعظیم کی بھی کافی حد تک کمی ہے۔ اس لئے ہم جمال و کمال اور مجد و شرف یعنی اس چیز کا جو ہم سے بہتر ہے۔ ادب و احترام نہیں کرتے یہ حقیقت موجودیت و صورت، عینیت و مثالیت، تخیل و تصوریت الغرض جملہ مظاہر و اعتبارات پر صادق آتی ہے۔ ثقافتی روایات کا تسلسل اور قومی خودی کا تعین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اس ظاہری ہیئت کا احترام نہ کریں، جو قوم کی اجتماعی روح کی تمثیلی مظہر ہے کہ ہمارے معیاری و مثالی نظریات یعنی دل و دماغ کی وہ خوبیاں جن کی ہم قدر و منزلت کرتے ہیں اور ان کی نشو و نما چاہتے ہیں اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آسکیں جب تک کہ ہم ان مثالی شخصیتوں کا احترام نہ کریں جو ان کی آئینہ دار ہیں۔ اس شخصی احترام اظہار عقیدت سے فرد عملی طور پر اپنی باطنی عزیمت اور ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ ان جمالیاتی و معنوی مطامح و مقاصد عالیہ کے لئے بدل و جان کوشاں ہوگا۔ قدروں اور نصب العین کے ساتھ ساتھ والہانہ عقیدت و وابستگی اس وقت تک ممکن نہیں جب کہ اس شخص کے ساتھ محبت و عقیدت نہ ہو جس کی ذات میں بدرجۂ کمال ان اوصاف کا ظہور اور جسمانی اعتبار سے

ان کا تعین ہوتا ہے قوم کی عظیم شخصیتوں کی تعظیم و تکریم اسی لئے ہمارے قومی کردار کی تعمیر میں ایک حیثیت رکھتی ہے۔

کلام کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ایک ایسا روحانی و اخلاقی انداز فکر پیدا کریں جس کی تاسیس انسانیتِ کبریٰ کے جاذبہ سے کی جائے۔ اس انداز فکر و عمل کی تخلیق و تشکیل میں اسلامی الہیات اور علم الاخلاق یا دینی تصورات و داعیات مثالی تصورات اور معیاری مطامح کی صورت میں مرکز ثقل کی طرح اہم جاذبہ کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سلسلے میں ہم غیر ملکی خیالات کی درآمد کریں ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ہم اسلامی ثقافت کے ان پہلوؤں پر زور دیں جن کا تعلق براہ راست انسانی فلاح و بہبود سے ہے۔

پراگندگی

اس قسم کا طرز عمل جو اجتماعی خیالات و افکار میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کا رجحان پیدا کرے اور طبائع کو حبّ الوطنی کے نقطۂ ارتکاز سے ہٹا دے، ہمارے معاشرہ میں پایا جاتا ہے یہ نتیجہ ہے عدم توازن شعور تناسب کی کمی اور مزے کی زندگی گزارنے کی خواہش کا۔ بہ الفاظ دیگر سہ خوش باش دمے کہ زندگانی این است۔ کا معاملہ ہے۔ قومی تعمیر دور اندیشی اور عاقبۃ الامور پر غائر نظر کی متقاضی ہے۔ ایسے معاشرہ میں جہاں محنت و دیانت سے کام کرنا مفید ثابت نہیں ہوتا اور الطاف و عنایات ذاتی مہربانی کی بنا پر ہوتی ہیں یا ذاتی ناراضگی کی بنا، پر روک لی جاتی ہیں بالآخر اختلال و انتشار کا راہ پا جانا ناگزیر ہو جایا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر طالب علموں میں جو بے ضابطگی یا بے راہ روی پائی جاتی ہے، اس کا سبب اساتذہ کی نااہلیت تغافل شعاری اور طالب علموں کی فلاح سے دلچسپی کا نہ ہونا ہے۔ اگر کسی تعلیمی ادارہ میں بے ضابطگی و بدنظمی پائی جائے تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اساتذہ یا تو نااہل ہیں یا اپنے فرض سے شعوری یا لاشعوری طور پر غافل ہیں یعنی اپنے طالب علموں کے لئے حکیم لبیب رہنمائے فہیم اور رفیق شفیق کے طور پر اپنے تعلیمی فرائض منصبی انجام دینے سے قاصر ہیں۔ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ معلمین، متعلمین کے قلوب میں

محبت و تعظیم کے جذبات کی نشو و نما نہیں کر سکتے۔ یعنی ان جذباتی عوامل و محرکات سے عاری ہیں جن سے ہیئت اجتماعیہ میں ضبط نظم کی اساسیں محکم ہوتی ہے۔ جیسا کہ کارلائل نے کہا ہے۔

• محبانہ رہبری کے معاوضہ میں محبانہ اطاعت انسان کی بنیادی ضرورت ہے" عبادت گاہوں اور قومی شعائر کی تعظیم اور علماء و حکماء، اور بالخصوص ان شخصیتوں کا عقیدتمندانہ احترام جن میں وہ خوبیاں متجسم ہوئی ہیں، جنہیں قوم نے اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ طلبہ کے نظم و ضبط کے اہم اجزائے ترکیبی ہیں۔ بالخصوص ان کے لئے جو ذہنی نشو و نما کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے ہیں۔

یعنی بچے لڑکے اور لڑکیاں جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے۔ اس منزل میں استاد کی شخصیت ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اگر یہ ممکن ہو تو کسی ایسے شخص کو استاد مقرر نہیں کرنا چاہیئے جو اپنے طلبہ کو صحیح ہدایت و تربیت نہیں دے سکتا۔ اور ان کے لئے ذہنی و اخلاقی برگ و ساز فراہم نہیں کر سکتا۔ جہاں کسی استاد میں شخصی جاذبہ نہیں ہوتا یا اس کی سیرت طلبہ میں اعتماد و احترام پیدا نہیں کرتی، وہیں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ بے راہ ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ہماری درس گاہوں میں مذہبی و اخلاقی تعلیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم جیسا کہ ہمیں بخوبی معلوم ہے محض معلومات یا علم بہتر سے مہیا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو قابلیتیں اور صلاحیتیں فطری طور پر طلبہ کے ذہن میں ودیعت ہیں، انہیں برآمد کیا جائے۔ ان کی نشو و نما کی جائے اور انہیں قوت سے فعل میں منتقل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی مضمر ہے کہ طالب علموں کی جبلی خصلتوں اور میلان و عواطف کی تعالی کی جائے۔ اور زندگی کے جمال و کمال کے حصول کے لئے ان میں ایک فعال تحریک پیدا کی جائے۔ وہ تعلیم جس میں زندگی کے اخلاقی اور جمالیاتی پہلو نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں مکمل نہیں کہلا سکتی۔ مدعا یہ ہے کہ طالب علموں کی بدنظمی و بے اعتدالی ایک اخلاقی مسئلہ ہے جسے محض والدین اگر باشعور ہوں اور اساتذہ اگر اہل ہوں، حل کر سکتے ہیں۔ شدت و مدت طوطی صفت

پڑھنے پڑھانے سے زیادہ طلبہ کی شخصیت کی نشوونما اور سیرت کی تشکیل پر ہونی چاہیئے اس میں دیانت سے روزی پیدا کرنے کی صلاحیت بھی شامل ہے۔

تعلیم، دانشوری، فکری تعالی اور روحانی تنویر کے وسیع مبادیات پر مبنی ہونی چاہیئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی نشوونما کی جائے جو اپنے وجود کو خیر و خوبی کے ساتھ دنیا میں قائم رکھ سکے۔ فی الحال ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اساتذہ کی دلچسپی محض یہ ہے کہ ان کے شاگرد امتحانات میں کامیاب ہوجائیں۔ انہیں شریف انسان یا دیانتدار شہری بنانا ان کا دردِ سر نہیں۔

اساتذہ میں معلمیت یعنی مثبت تخیلی و تصوری معیاریت کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے نوجوان جب اپنی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں تو ان کے ذہن متوحش ہوتے ہیں۔ نہ ان کی روح اخلاقی شعور اور صحیح وجدان سے مستفیض ہوتی ہے۔

جائز مقاصد کیلئے جائز وسائل

ہم میں یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ ہم ایک ایسے مقصد کے لئے جس کے بارے میں ہم اپنے آپ کو یقین دلادیتے ہیں کہ وہ حق بجانب ہے۔ ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ یہ غلط اندازِ فکر بہت سی مخرب اخلاق عادات و رسوم کا باعث ہے۔

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ مبنی برحق مقاصد کے لئے مبنی برحق وسائل سے کام لیا جائے کوئی مدعا خواہ وہ کتنا ہی عالی و معدلت پرور کیوں نہ ہو، مکر و فریب یا ناحق وسائل کے استعمال کو جائز نہیں بناسکتا۔ اساتذہ اور معلمین اخلاق اور سیاسی حکماء کو خاص طور پر اس بات پر زور دینا چاہیئے کہ جائز مقاصد کے لئے جائز وسائل لابدی ہیں بصورتِ دیگر صحیح قومی سیرت و کردار کی تعمیر از قبیل محالات ہے۔

ہمارے معاشرہ میں تحمل و رواداری کی بڑی کمی ہے۔ فکری اعتبار سے بھی اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔ جونہی ہمیں کسی شخص سے اختلاف رائے ہوتا ہے ہم اس کے اخلاص

کو مشتبہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو بظاہر ہمیں اپنے ماضی سے وراثت میں ملی ہے۔

ہم رواداری نہیں ہیں باوجود اس کے کہ بنیادی طور پر اسلام نے ہمیں دینی و مذہبی ہر قسم کی رواداری کا عقیدہ دیا ہے اور منکرات و فواحش (یعنی وہ ممنوعات و محرمات جنہیں عالم انسانیت نے متفقہ طور پر معاشرہ کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر ضرر رساں قرار دیا ہے) کو روکنے کے علاوہ اس کے ہاں اور کوئی جبر و اکراہ نہیں۔

ماہنامہ تجلی دیوبند کا حاصل مطالعہ نمبر

یکم اگست ۱۹۶۶ء کو شائع ہو رہا ہے

- ایسے منتخب مضامین کا ضخیم مجموعہ جو آپ کے لئے تحفۂ نادرہ ثابت ہوں گے۔
- لطف یہ ہے کہ تجلی کے مستقل عنوانات مثلاً "تجلی کی ڈاک" اور "مسجد سے میخانہ تک" بھی اس میں موجود ملیں گے۔
- ملا ابن العرب مکی اس نمبر کے صفحات پر ایک ایسے ناول کے سے داخل ہو رہا ہے کہ شائد عرصۂ دراز تک آپ اسے نہ بھلا سکیں۔
- اس مختصر اعلان میں تعارف کی گنجائش کہاں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح آج تک تجلی نے آپ کو مایوس نہیں کیا انشاء اللہ یہ نمبر بھی آپ کے ذوقِ مطالعہ کے لئے خاصے کی چیز ثابت ہوگا۔
- تجلی کے سالانہ خریداروں کو یہ نمبر مفت ملے گا۔ آپ آج بھی آٹھ روپے بھیجکر سالانہ خریدار بن سکتے ہیں۔
- قیمت تین روپے ہوگی ـــ جو حضرات سالانہ خریدار بنے بغیر تنہا یہی نمبر حاصل کرنا چاہیں وہ ڈاک خرچ ملا کر چار روپے روانہ فرمائیں۔
- ایجنٹ حضرات دس جولائی تک اپنی مطلوبہ تعداد سے دفتر کو آگاہ کردیں۔ تاخیر مناسب نہ ہوگی۔

منیجر مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)